
علامہ اقبال اور
مولانا مودودی
مرکزی مکتبہ اسلامی
دھلی

مطبوعاتِ اشاعتِ اسلام ٹرسٹ — ۴۷۶



ڈاکٹر سیّد انور علی

مرکزی مکتبہ اسلامی
دہلی ۱۱۰۰۰۶

بار اوّل ——— دسمبر ۱۹۸۰ء ——— ۲۰۰۰

قیمت:- ۵۰/۱

مطبوعہ
جے۔ کے آفسٹ پرنٹرز، دہلی ۶

عرضِ مولف

"علامہ اقبال اور مولانا مودودی" کوئی الگ سے مقالہ نہیں ہے بلکہ دراصل یہ وہ مقدمہ ہے جو پروفیسر عمر حیات صاحب غوری کی کتاب "اقبال و مودودی" (زیر طبع) کے لیے لکھا گیا تھا۔ پروفیسر غوری صاحب اور دیگر احباب کا خیال ہے کہ اس میں بعض ایسے نکات زیرِ بحث آگئے ہیں جن سے تحریکِ اسلامی کے افراد استفادہ کرسکتے ہیں اس لیے علیحدہ سے شائع کرنا چاہیے۔ اسی مشورہ کے پیشِ نظر زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچانے کے لیے اسے الگ سے شائع کیا جا رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ توقعات کے مطابق مفید ثابت ہو۔

سیّد انور علی

۲۷ر جون سنہ ۱۹۸۰ء

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

علامہ اقبال اور مولانا مودودی

اس کائناتِ بسیط میں انسانی کارواں ہزاروں سال سے محوِ خرام ہے۔ لاکھوں اور اربوں انسانی زندگیاں پیوندِ خاک ہو چکی ہیں۔ موت سے نہ پہلے کسی کو رستگاری تھی اور نہ اب ہے۔ جو بھی ذی روح اس کرۂ خاکی پر قدم رکھتا ہے اس کے لیے بس ایک مدتِ خاص مقرر ہے۔ قرآن کے قاعدۂ کلیہ "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ" سے کسی کو مفر نہیں ہے۔ مگر کثیر افراد ایسے ہیں جن کا اس دنیا میں آنا اور یہاں سے چلا جانا کاروانِ انسانی کے لیے کسی خاص دلچسپی اور اہمیت کا حامل نہیں ہوتا البتہ بعض ایسی ہستیاں ہوتی ہیں جن کے اثرات انسانی سماج پر کچھ اتنے گہرے اور وسیع ہوتے ہیں کہ صدیاں گذر جائیں لیکن ان کی یاد جب بھی آتی ہے آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں، دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے اور جذبۂ رشک کروٹیں لیتا ہے کہ کاش ہم بھی ایسے ہوتے۔ ان ہستیوں میں اپنی ہمہ گیری اور اثر پذیری کے لحاظ سے صفِ اول میں وہ ہیں جو احکامِ خداوندی کے امین و رازدار اور پیامبر تھے اور جنکی زندگیاں اُس دعوت و تحریک کے لیے وقف تھیں جنہیں عرف عام میں دعوتِ اسلامی کہا جاتا ہے، اس کے بعد وہ ہیں جو اُن کے نقشِ قدم کے پیرو اور دعوتِ الٰہی کے وارث تھے۔ میری مراد خلفائے راشدینؓ، صحابہ کرامؓ، ائمہ وقت، مجددینِ عصر اور بزرگانِ دین سے ہے۔

اس سرزمینِ عجم کو بھی، جسے دیارِ ہند کہتے ہیں، یہ فخر حاصل ہے کہ اُس کی آغوش میں بھی ایسے نقوشِ قدسیہ نے جنم لیا ہے جن کی ہمہ گیری مسلم ہے اور جن کے اثرات دیرپا ہیں۔ خود ماضیٔ قریب میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ہستی ایسی ہے جس نے فکر و خیال میں انقلاب پیدا کیا، عجمی خیالات کی تردید کی، دین کے چشمۂ صافی میں جو گرد و غبار آگیا تھا اُسے دُور کیا اور آفتاب دین مبین کی کرنوں کی راہ میں جو چیزیں سدِّ راہ بنی تھیں انہیں ہٹا دیا۔ عقیدۂ توحید سے لے کر عبادات و سیاست اور معاشرت وغیرہ کے تمام شعبوں میں جہاں جہاں غیر اسلامی چیزیں گھس آئی تھیں اُن پر بے لاگ طور پر تیشہ چلایا اور اُمتِ محمدی کے سامنے ایک بار پھر اسلام کی صحیح اور مکمّل تصویر پیش کر دی۔ برسوں سے اُمّت کے نزدیک نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی کو مکمل دین سمجھ لیا گیا تھا اور قرآن کے دوسرے معاشرتی، قانونی، فوجداری اور معاشی احکامات وغیرہ سے صرفِ نظر کر کے اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام سے یک گونہ بے پروا ہوکر شاہی نظام کے تحت اطمینان کے ساتھ زندگی گذاری جارہی تھی۔ حق کے غلبہ کا تصور، عمل کی دنیا میں نابید ہوکر رہ گیا تھا —— یہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا کارنامۂ عظیم ہے کہ انھوں نے امتِ مسلمہ کو اسلامی نشاۃِ ثانیہ کی راہ دکھائی اور خلافت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا، حکومتِ الٰہیہ کے قیام پر زور دیا اور اپنی تحریروں کے ذریعہ دلوں میں یہ بات بٹھادی کہ بغیر قیامِ حکومت کے نہ تو پورے احکامِ قرآنی پر عمل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی باطل قوتوں کے خلاف اسلام کو غالب کیا جاسکتا ہے۔ اُنہیں کی تحریروں کا اثر تھا جو رفتہ رفتہ دلوں کو مسخر کرتا رہا —— یہاں تک کہ سو سال بعد حضرت اسماعیل شہیدؒ نے عملاً حکومتِ الٰہیہ کے قیام کیلیے سرفروشانہ جد و جہد شروع کی اور اپنے خلوص، طریقہ کار اور مجاہدانہ کارناموں

کی ایک ایسی روشن تاریخ چھوڑ گئے جس سے اس راہ کا مسافر سدا نشانِ راہ حاصل کرتا رہے گا۔ فکرِ ولی اللہی کے وارثوں میں جہاں اور نام لیے جا سکتے ہیں وہاں علامہ اقبال اور مولانا مودودی کو بعض وجوہ کی بناء پر ترجیح حاصل ہے۔

علامہ اقبال نے اس وقت آنکھ کھولی جب دیارِ ہند سے مغلیہ سلطنت کی بساط لپیٹی جا چکی تھی۔ مغربی تہذیب و تمدن کی بالادستی قائم تھی۔ سیاسی غلامی نے مسلمانوں کے اندر ذہنی غلامی بھی پیدا کر دی تھی۔ ہمارے صاحبِ فکر و ثروت قوم کو "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" کی تعلیم نہ صرف زبانی دے رہے تھے بلکہ دل و جان سے عملاً اس کے لیے کوشاں تھے۔ مغربی فکر و نظریہ کو تاویلات کے پُر پیچ طریقوں سے اسلام کے مطابق یا قریب تر ثابت کرنے کی سعیِ لاحاصل مختلف انداز سے چل رہی تھی۔ قرآن کی جو باتیں مفکرین مغرب ماننے سے انکار کرتے یہ گروہ یا تو جی حضوری کے طور پر انکار کر دیتا یا پھر لایعنی تاویلات سے کام لیتا۔ مغربی تہذیب و افکار کے سیلاب کے آگے علماء نے بند باندھنے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ طوفانِ مغرب کی یلغار دیکھ کر اکثر لوگ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں سے نکلا ہوا تعلیم یافتہ طبقہ مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا۔ وہ دیکھتے اپنی آنکھوں سے تھے لیکن غور و فکر کے سانچے مغربی ساخت کے تھے۔ اسلامی شعار اور تہذیبی آثار سے یک گونہ دوری ہی نہیں بلکہ نفرت سی ہو چلی تھی اور حکم اس طبقہ کی نقالی گویا نشانِ وقار و عزت بن چکا تھا۔ اس فضا میں جو پوری قوت سے چھائی ہوئی تھی کسی ایسی شخصیت کا ابھرنا جو اُس کے اندرون میں جھانک کر نسلِ انسانی کو اس کی ہلاکت خیزیوں سے باخبر کر سکے ممکن نہ تھا لیکن کارخانۂ قدرت میں ایسے حادثات و واقعات کی کمی نہیں جو خلافِ توقع رونما ہوتے ہیں۔ اُنہیں میں سے ایک اقبالؒ کا وجود بھی ہے۔

شروع میں وہ مغربی تعلیم کی بنا پر مغربی فکر سے متاثر ہوئے اور قومیت و وطنیت کو غلامی سے نجات کا سبب سمجھا چنانچہ ابتدائی نظموں میں اُن کے خیالات کا بھر پور عکس دیکھا جا سکتا ہے لیکن خدا نے انہیں جو ذہن و دل دے کر دنیا میں بھیجا تھا وہ ہمیشہ سے خوب سے خوب تر کی تلاش میں تھا چنانچہ جوں جوں مغربی تہذیب کے قریب تر ہوتے گئے اس کی اصل حقیقت ان پر واضح ہوتی چلی گئی۔ یورپ کے سفر نے اس بار ایٹ لا کو مغربی تہذیب و تمدن کے ہر خدو خال اور نقش و نگار کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ تہذیب مغرب کے سمندر میں جس قدر غوطہ زن ہوتے رہے اس کی تہ میں چھپی ہوئی آلائشیں ان کے سامنے آتی گئیں طوفانِ مغرب کے تھپیڑے کھا کھا کر اسلام کی حقانیت کے قائل ہوتے گئے اور اپنی آپ بیتی کو اس شعر میں ڈھال دیا۔

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے، گوہر کی سیرابی

ہر کوچۂ فکر کی سیر کرنے کے بعد جب اسلامی فکر پر دل مطمئن اور ذہن یکسو ہو گیا تو سب سے پہلے ان کی نظر مسلمانوں کی زبوں حالی پر گئی۔ ماضی کی شاندار تاریخ رکھنے والی اس امت کے زوال کی بناء اس کی اسلام سے دوری اور خدا و رسول کے احکامات سے بے پرواہی میں نظر آئی چنانچہ آپ نشاطِ انگیز کے لیے ساقی سے دستِ سوال دراز کیا اور سراپا سوز و گداز بن کر پکار اُٹھے

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے، ترا فیض ہو عام اے ساقی

اور یہ صرف آرزو کی حد تک بات نہ تھی بلکہ طلبِ صادق کی آواز تھی اس لیے

اسلام کے اصل ماٰخذ قرآن مجید اور حضورؐ کی سیرت کے شیدائی بنے۔ پندرہ سال مسلسل قرآن کا مطالعہ کرتے رہے اور بعض آیات پر برسوں غور و فکر کیا ہے تب جا کر اس درجہ پر پہنچے کہ عصرِ حاضر کے پیدا شدہ مسائل کا حل صرف قرآن سے ڈھونڈھ نکالتے تھے اور مغربی مفکرین کے فلسفیانہ سوالات کے جوابات کے لیے قرآن ہی کو کافی سمجھتے تھے۔ خلیفہ عبدالحکیم کے بقول علامہ اقبال کا عقیدہ تھا کہ ''انسانی زندگی کے مزید ارتقاء میں کوئی دور ایسا نہیں آسکتا جس میں قرآنی حقائق کا نیا انکشاف ترقیٔ حیات میں ان کی رہبری نہ کر سکے۔ زندگی کی نو بہ نو صورتیں پیدا ہوتی جائیں گی۔ لیکن قرآن کے اساسی حقائق کبھی دفترِ پارینہ نہ ہوں گے''۔ قرآن سے اُن کے شغف کا کیا عالم رہا ہوگا اس کا اندازہ انہیں کے شعر

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

پر غور کرنے سے لگایا جاسکتا ہے۔ ''نزولِ کتاب'' کی کیفیت کا تصور جتنا گہرا ہوگا اُتنا ہی آپ اس کا ادراک آسانی سے کرسکیں گے کہ اقبالؒ نے قرآن سے کیا کچھ اخذ کیا ہوگا اور آیاتِ قرآنی کا معنی و مفہوم ان پر کس قدر واضح رہا ہوگا حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں ''کلام اللہ کی تلاوت کرتے وقت جس کے ضمیر پر نزولِ قرآن کی کیفیت ہو جائے سمجھیے کہ اُسے گوہرِ مراد مل گیا۔ تمام حقائق اور علوم کا مخزن یہی کتاب ہے'' انسان کی رہنمائی کے لیے جس قدر ضرورت ہو سکتی ہے قیامت تک کے لیے اس میں اس کا سامان فراہم کر دیا گیا ہے۔ ''بحر العلوم'' کا لفظ اگر کسی کتاب پر موزوں ہو سکتا ہے تو وہ یہی قرآن ہے جس کو آج کے مسلمان نے حریر و ریشم کے جزدانوں میں سجا کر طاق کی زینت بنا رکھا ہے اور جس سے وہ بھوت پریت بھگانے کا کام

لیتا ہے حالانکہ یہ کتاب اس لیے اتاری گئی ہے کہ انسانوں کی صحیح رہنمائی کی جائے باطل قوتوں سے کشمکش کر کے ان کو سرنگوں کیا جائے اور خدا کی خدائی و کبریائی کا غلغلہ بلند کیا جائے، انسان پر سے انسان کی خدائی کا قلادہ اتار پھینکا جائے اور اس کی گردن کو صرف خدا کے حضور جھکایا جائے اور پوری دنیا کو یہ بتایا جائے کہ سروری زیبا فقط اسی ذاتِ بے ہمتا کو ہے اور باقی سب بتانِ آذری ہیں جن کے سامنے سجدہ ریز ہونا یا اُن سے اُمید و بیم کے جذبات وابستہ رکھنا انسانیت کے لیے ننگ ہیں۔

اقبال نے جب یورپ میں اسلامی لٹریچر کے وسیع ذخیرے کا مطالعہ کیا تو اُسے معلوم ہوا کہ اسلام کیا ہے اور اس کے فلسفۂ حیات و کائنات کی اثر گیری اور وسعت کیا ہے اور مسلمانوں کے علمی کارنامے اہلِ فرنگ کے لیے کس قدر نقوشِ راہ ثابت ہوئے ہیں؟ اپنے اس اسلامی علم کی روشنی میں جب اس نے مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیا تو اُن کی زبوں حالی کا باعث تین چیزیں دکھائی دیں۔

الف:- خالص عقیدۂ توحید سے دوری

ب:- جمودِ عمل کا جواز برنگ تصوف

ج:- محبتِ رسول سے بے نیازی

اقبال نے انہیں تین باتوں کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کو ان کا بھولا سبق یاد دلانے کی کوشش کی۔ صحیح نظریہ توحید سے آشنا کیا اور مختلف انداز سے ان کے ذہن و قلب پر حقیقتِ توحید آشکارا کرنے کی سعی کی اس لیے کہ فرد و جماعت کا سرمایہ اسرار یہی لا الہ ہے، بے غرض اخلاق و تمدن اور بے لوث سیاست و معیشت کے سوتے اسی سے پھوٹتے ہیں، نوعِ انسانی کو اگر ہر قسم کی

غلامی سے نجات مل سکتی ہے تو اسی سے اور کائنات و حیات کا معمہ اگر حل ہو سکتا ہے تو اسی سے۔

ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ　　ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما　　رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما
نقطۂ ادوارِ عالم لا الٰہ　　منتہائے کارِ عالم لا الٰہ
لا و الا احتسابِ کائنات　　لا و الا فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون　　حرکت از لا زاید از الاّ سکوں
تا نہ رمزِ لا الٰہ آید بدست　　بندِ غیر اللہ را نتواں شکست
خودی سے اس طلسمِ رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں　　یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا
بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی　　مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیاء کی جہانگیری　　یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا　　اتر گیا جو ترے دل میں لا شریک لہٗ

مسلمان کی اصل متاع، ایمانِ محکم ہے۔ وہ جس قدر توحید کی لذت سے آشنا اور غیر اللہ سے بے نیاز ہو گا اس کا قلب اتنا ہی تسکین و اطمینان کا گہوارہ بنے گا، اس کی زندگی اس کائنات کے لیے اسی قدر ضروری اور مفید تر ہو گی اس کے کردار و عمل سے وہ شعاعیں پھوٹیں گی جو گرد و پیش کی فضا کو منور کر کے رکھ دیں گی صحابہ کرامؓ کی پاک زندگیوں میں اعمالِ صالحہ کے جو حسین نقش و نگار ملتے ہیں وہ سب اسی فکرِ توحید کے رازہائے سر بستہ کے عملی ظہور تھے۔ زمانۂ بعد میں جو بھی انسانیت کے لیے گلِ سرسبد بن کر ابھرا ہے اس کی خمیر میں بھی توحید کارفرما تھی۔ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی سرفرازی و سربلندی کے لیے توحید سے گہری آشنائی ناگزیر ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا

ہے کہ جب تک مسلمان اجتماعی طور پر مئے توحید سے سرشار رہے صاحبِ لولاک بن کر رہے لیکن جس قدر اس تصورِ توحید میں ضعف آیا اسی نسبت سے وہ ذلت و نکبت سے دوچار ہوئے۔ توحید کیا ہے، اس کے مقتضیات و اثرات کیا ہیں؟ اقبال ہی کی زبان سے سنیے۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ

یہ دَور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنمکدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریب سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ

یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکان کی زُناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

لیکن اس معیار پر جب وہ امت مسلمہ کو پرکھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ صنمکدہ تو ہے لیکن براہیم نہیں، 'فریب سود و زیاں' میں ہر شخص گرفتارِ محض ہے، مال و دولت اور سیم و زر ہی اصل متاع بن چکے ہیں، نغمۂ توحید کے بلند کرنے کیلیے جس امت کو 'بہار و خزاں سے بے نیاز ہو کر حکم دیا گیا تھا اس کی زبان نامساعد حالات کی بناء پر خاموش ہو گئی ہے۔ لاالہ کی دعوت کو لے کر اٹھنے اور دنیا میں اس کے عَلَم کو گاڑ دینے سے زیادہ بہتر اور سرور آگیں شے صوفیانہ رموز و اشارات بن چکے ہیں۔ کشمکشِ زندگی سے گریز کو اصل دنیا سمجھا جا رہا ہے۔ صحابہ کرام کی مجاہدانہ زندگیوں سے جوش و مستی، سرور و انبساط اور ایمان و حرارت لینے کے بجائے حجرۂ صوفی کی پُرامن فضا کو کافی سمجھ لیا گیا ہے اس لیے کہ وہاں متاعِ مال و جان کی زیاں کے بغیر جنت کی بشارت مل جاتی ہے۔ اس عجمی تصوف نے

مسلمانوں کو جوشِ کردار اور کفن بردوشِ زندگی سے بیگانہ کر دیا ہے اور اُسے فکر مضمحل دے کر رفتہ رفتہ غلامی پر رضامند کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف اگر اقبال نے غلامی کو ذوقِ حسن و زیبائی سے محروم بتا کر اور غلاموں کی بصیرت پر بھروسہ نہ کرنے کا اعلان کر کے روحِ مسلم کو اضطراب سے ہمکنار کیا تو دوسری طرف اس نے موجودہ تصوف خام پر بھی تیشہ چلایا جس نے مسلمانوں میں جمود اور اضمحلال پیدا کیا اور باطل کے مقابلہ میں صف آرا ہونے کے بجائے فرار کا راستہ دکھایا اور اس راہِ فرار کو تقدس کی سند بھی عطا کی۔

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ امت روایات میں کھو گئی

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا، حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

• یہ حکمتِ ملکوتی، یہ علمِ لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

• یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

• اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے نمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ

• سکھا دیے ہیں اُسے شیوہ ہائے خانقہی
فقیہِ شہر کو صوفی نے کر دیا ہے خراب

• ہیں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

• اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خونِ دلِ شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

• یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

• تیری بیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور   تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ
• ترے دین وادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی   یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری

اس عجمی تصوف کا اثر تھا کہ دانشِ دین و علم و فن، بندگیِ ہوس بن چکی تھی، ایران و توران میں وہ بندے ناپید تھے جن کا فقر ہلاکِ قیصر و کسریٰ تھا اور وہ سجدہ جس سے روحِ زمین کانپ جاتی تھی خود اسی کو منبر و محراب ترسنے لگے تھے۔ اقبال نے پیغامِ خودی دے کر مسلمانوں کو ان کا منصب یاد دلایا کہ تم راہبر ہو راہرو نہیں، امامت کا کام تمہیں انجام دینا ہے، دنیا میں تمیز خیر و شر کی علامت تم ہو، شرف انسانیت کا جوہر تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ تمہارا جمود صرف تمہارے لیے نقصان دہ نہیں ہے بلکہ پوری دنیا کی گمراہی کا ذمہ دار بھی ہے۔ اقبال نے مسلمانوں کو یہ پیغام اس لیے دیا تھا کہ وہ جہانِ آب و گل میں اپنی فطری قوتوں اور صلاحیتوں سے کام لیں، تسخیر کائنات کا حق ادا کریں اور حیاتِ دنیا میں تمیز حق و باطل کا فریضہ انجام دے کر نسلِ انسانی کی رہبری کریں۔ طوفانِ حیات کی ہر موج کے مدمقابل ہو کر اپنی کشتی کو رواں دواں رکھیں اس لیے کہ زمانہ ہر اس قوم کو کچل کر رکھ دیتا ہے جو جمود کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہاں ہر لحظہ اور ہر آن بدلنے والے زمانہ کا ساتھ دینے والا اور اس کا عناں گیری کرنے والا ہی ترقی کی شاہراہ پر پیش قدمی کر سکتا ہے۔ جس نے بھی اس اصول سے انحراف کیا راستے سے ہٹا دیا گیا۔ تصوف سے اس کی ناراضگی صرف اسی وجہ سے ہے کہ اس نے قوائے عمل کو مضمحل کیا، زندگی سے گریز اور کشمکش خیر و شر سے فرار سکھایا اور سعی و عمل سے دور رہنے کی تلقین کی۔ تصوف پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

" یہ حیرت کی بات نہیں کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ جس قوم میں

طاقت اور توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی، تو پھر اس قوم کا نقطۂ نظر بدل جاتا ہے۔ اُن کے نزدیک ناتوانی حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجب تسکین۔ اس ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی اور کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع البقاء میں ہو، چھپایا کرتی ہیں خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ ان کی ادبیات کا انتہائی کمالِ لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا"

(اقبال نامہ صفحہ ۴۵)

جس طرح فلسفۂ توحید کے بغیر کاروانِ انسانیت کا صحیح رخ متعین نہیں ہو سکتا ہے، اُسی طرح راہ سے گمراہ نہ ہونے کا مدار اس پر ہے کہ ہر موڑ پر کوئی روشنی ہو جو رہنمائی کرے، ہر دوراہے یا چوراہے پر پہنچ کر جب کسی ایک راستہ کے انتخاب کا معاملہ درپیش ہو تو شک و شبہ سے بالاتر کسی قابلِ اعتماد شخصیت کے غیر مبہم نشاناتِ راہ، سمتِ سفر کا پتہ دیں۔ یہ دنیا اور اس کے نت نئے انداز و شان کا ظہور جس قدر پر پیچ ہے اُسے کچھ وہی سمجھ سکتا ہے جو کچھ متعین اصولوں کو لے کر اس دنیا کی صورت گری کے لیے اٹھے اور پھر دیکھے کہ یہ دنیا ہر لحظہ کس نئی آن بان سے مدِ مقابل آتی ہے اور کس طرح ایک اصول پسند شخصیت کے لیے سعی و عمل کے ہزار در ہزار افق کھولتی جاتی ہے اور اُسے دعوائے مبارزت و تسخیر دیتی ہے۔ کیسے کیسے مغالطہ آمیز مقامات آتے ہیں جہاں اصول کی پاسداری انسان کو کسی فیصلے کے سلسلہ میں مذبذب کر کے رکھ دیتی ہے۔ جہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی اس کی رہنمائی کرے۔ "مسلمان" چونکہ ایک بے لاگ اصول پسند شخصیت کا نام ہے اس لیے اس کو بھی ہر لمحہ کسی نہ کسی موڑ سے دوچار ہونا پڑتا ہے جہاں اُسے اپنے فلسفۂ حیات اور اصولوں کے مطابق فیصلہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

بے لاگ اصول پسندی کی وجہ سے اس کو دنیا کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ایک ایسی شخصیت کی ضرورت ہے جس کے نقوشِ قدم اُسے منزل کے صحیح رُخ کا پتہ دے سکیں اور تذبذب کے ہر موڑ کو یقین و اذعان میں بدل دیں اقبال نے پوری تحقیق و جستجو اور مکمل اطمینان قلب کے بعد دنیا کو یہ بات بتائی کہ جس کو اسلام کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارنی ہے اس کے لیے حضورؐ کی محبت و اطاعت سے گریز ممکن نہیں ہے۔ اس کے نزدیک مسلمانوں میں عشقِ رسولؐ کا جذبہ جس قدر شدید ہوگا اتنا ہی انہیں کشمکشِ حق و باطل میں لذت ملے گی، تکالیف اور مصائب آسان ہوں گے اور جاں سپاری مشغلۂ حیات بن جائے گا یہ عشقِ رسول کا ہی جذبہ تھا جس نے اقبال سے کہلوایا:۔

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر — مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری
اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ — آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ — سرمہ ہے مری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اقبال کے نزدیک مسلمان اور انسانی کارواں کے لیے اگر کہیں سے راہِ ہدایت مل سکتی ہے تو قیامت تک کے لیے محسنِ انسانیت، محمدؐ عربی کے اسوہ حسنہ سے مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جس در سے وہ رہنمائی حاصل کرے گا عارضی ہوگی اور دو قدم چل کر ٹھوکر کھانی پڑے گی۔ حضورؐ کے درِ اقدس سے کیا کچھ مل سکتا ہے اسکی تفصیل پیش نہ کر کے اقبال نے جوابِ شکوہ میں خدا کا یہ مختصر مگر جامع پیغام پہنچا دیا کہ

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں — یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اور یہی رہتی دنیا تک معیار خالص ہے جس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔

سائنسی دَور کے طلوع ہونے اور مغربی تہذیب کے افکار اساسی نے جہاں مختلف انداز سے مسلمانوں کو متاثر کیا وہاں جس چیز نے سب سے زیادہ

تباہ کن اثر ڈالا وہ دین و دنیا کی تفریق کا فلسفہ تھا مسلمان، جو رائج الوقت نظاموں کے مقابلہ میں 'ایک خدا ایک انسان اور ایک نظام'، کا تصور لے کر اٹھا تھا وہ حسرتا کہ وہی دین و دنیا کی تفریق کو صحیح سمجھنے لگا۔ باطل کی سر بزیری کے بجائے اس کی نظریں ہٹ کر خانقاہی درویشی پر جم گئیں یعنی بقول اقبال۔

اُسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم ؛ جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

خود علماء کے لیے جبہ و دستار و عمامہ کا رکھ رکھاؤ اتنا اہم بن گیا کہ میدانِ جہاد کے گرد و غبار سے محفوظ رہنے کے لیے دستۂ شمشیر سے بے نیاز ہو گئے اور اپنی اس روش پر عامۃ المسلمین کو خدا و رسول ؐ ہی کے نام پر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ہو سکتا ہے کہ صاحبِ اقتدار کے جبر و ظلم اور ان کی تلواروں کی خوں آشامی بھی اس صورتِ حال کی ذمہ دار ہو مگر یہ لوگ تو وہ تھے جو جان بوجھ کر اپنی جان و مال کا سودا کر کے خدا پر ایمان لائے تھے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ان حضرات نے خاموشی کو ترجیح دی تو دی لیکن بعد میں اُسی پر ایسا اطمینان کر لیا کہ فسق و فجور کے کارندے مسندِ حکومت پر متمکن ہوتے رہے اور یہ علماء اور فضلاء انہیں دعائے خیر سے نوازتے رہے (یقیناً خال خال ایسی شخصیتیں بھی ملتی ہیں جنہوں نے ہر دور میں حق بات کی نمائندگی کی اور حق تو یہ ہے کہ اس کا حق ادا کر دیا لیکن یہاں بات عام علماء کی ہو رہی ہے) دس بارہ صدیوں سے اسی فکر کی نمائندگی عام طور پر ہوتی رہی ہے، چنانچہ مسلسل سیاست و اقتدار سے نفرت، کشمکشِ زندگی سے اجتناب اور اوراد و وظائف کے ذریعہ حصولِ جنت ہماری امتِ مسلمہ کے کثیر حصہ کا وطیرہ بن چکا ہے۔ جن لوگوں کے اندر اوراد و وظائف کے مجاہدہ کی ہمت نہ تھی وہ کسی گوشہ نشین بزرگ کے مرید ہو گئے اور مطمئن ہو گئے کہ جنت ان کے نام محفوظ ہو گئی حالانکہ جنت کے لیے وصفِ ناگزیر یہ ہے کہ خدا و رسول ؐ کے کسی حکم کو ٹوٹنے نہ دیا۔

جائے اور اگر اس کی حفاظت کی قوت موجود نہ ہو تو کم از کم زبان سے اظہارِ حق کیا جائے اور اگر شمشیر و سناں کے خوف اور جور و استبداد کی وجہ سے اسکے بھی مواقع نہ ہوں تو دل کے اضطرابِ پیہم سے تو سینہ خالی نہ ہو لیکن یہ کیا کہ فسق و فجور کے علمبردار تختِ حکومت پر جلوہ افگن ہو کر خدا اور رسول کے احکامات سے نہ صرف روگردانی کریں بلکہ تمسخر آمیز سلوک کریں اور مسلمانوں کی اکثریت عبادات کے غایتِ اصلی سے بے پروا ہو کر صرف معروف عبادات کی بجا آوری کو سب کچھ سمجھ لیں اور جب ان اربابِ تخت و تاج کو ضرورت پڑے تو دعائے خیر سے بھی نوازیں۔ جن لوگوں کا علم انہیں بتاتا ہو کہ سلطانِ جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا جہاد ہے انکی خاموشی اور ان کا بادشاہوں کو دعائے خیر سے نوازنا ایک ایسا عقدہ ہے جس کی گرہ کشائی بہت مشکل ہے۔ اسی طرزِ فکر یعنی دین و دنیا کی تفریق کا نتیجہ ہے کہ اب تک ہمارے ذہن و فکر پر یہی بات مستولی ہے کہ سیاست گندی چیز ہے اس کو تقویٰ سے کیا نسبت؟ اسلامی نظامِ حکومت کے قیام کے لیے جد و جہد ضروری نہیں، حجرہ و خانقاہ میں اگر عبادات کی بجا آوری سکون سے ہو جاتی ہے تو بس کافی ہے یعنی بقولِ اقبال ؎

ملاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ۔۔۔ ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ بوالعجبی نہیں تو کیا ہے کہ ایک ہی ''اللہ'' کو جب 'رزاق'، کہیں تو بالکل ٹھیک 'رب'، کہیں تو بجا 'الٰہ'، کہیں تو عین حق لیکن 'حاکم'، اور 'مالک الملک' سمجھیں اور اسی کے حکم کو غالب کرنے کے لیے اٹھیں تو ہمارے بزرگوں کی جبینوں پر شکنیں پڑ جاتی ہیں اور اُن کی قوتِ شامہ اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ دلوں کے اندر کی نیت بھی سونگھ لیتی ہے۔ وہ صاحبِ غیب کے مقام پر بیٹھ کر فتویٰ دیتے ہیں کہ ان سب کے پیچھے ''اقتدار کی ہوس'' کارفرما ہے خود اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے نہیں اٹھتے

لیکن جو اٹھتا ہے کہ خدا کا نام بازار سے لے کر ایوانِ حکومت تک چھا جائے یہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ غلط سلط باتیں اس سے منسوب کر کے عوام میں غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں اور اس کی راہ کے پتھر بن جاتے ہیں۔ ان بزرگوں کا احترام اپنی جگہ بجا سہی لیکن کسی قطب، کسی ابدال اور کسی بزرگ کی پسندیدگی کو معیار نہیں بنایا جا سکتا اگر اس کے ڈانڈے جادۂ اسلام سے نہیں ملتے۔ کسی انسان کے لیے خواہ وہ کتنا ہی تقدس مآب ہو نہ خدا کی کتاب بدلی جا سکتی ہے، نہ رسولؐ کی شریعت بدلی جا سکتی ہے۔ جس خدا نے اپنی کتاب 'قرآن' میں یہ واضح طور پر بتایا ہو:

يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ (آل عمران: ۱۵۴)

وہ کہتے ہیں ہمارا بھی کچھ اختیار ہے، کہو اختیار سارا کا سارا اللہ ہی کا ہے۔

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (الاعراف: ۵۴)

خبردار، اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○ (یوسف: ۴۰)

حکم اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی صحیح دین ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ ○ (التین: ۸)

کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے۔

وَلَمْ يَكُن لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ (الفرقان: ۲)

اور بادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ○ (المائدہ: ۴۴)

اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ۔ (المائدہ:۴۸)

ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

اُس کے مقابلہ میں کہاں سے جرأت لائی جائے اور کہا جائے کہ سیاست تقویٰ کے منافی ہے اور اسلامی بنیادوں پر نظامِ حکومت کے قیام کی جدوجہد غیر ضروری چیز ہے۔ جس دعوت اسلامی کا آغاز لا الٰہ الا اللہ سے ہو کر قیام سلطنت پر منتج ہوا اور جس کا پہلا سربراہِ مملکت خود رسولِ خدا تھا اس کے قیام کو کیونکر اقامتِ دین سے خارج سمجھا جائے اور خدا کے نام کو بلند کرنے اور دین کو پورے روئے زمین پر غالب کر دینے کی سعیٔ مسلسل کو کیسے زہد و تقویٰ کے منافی سمجھنے کی ہمت کی جائے۔ بات اگر صرف رسول خدا تک رہ جاتی تو شاید عام مسلمانوں کو کسی تاویل سے بہکایا جا سکتا تھا لیکن یہاں تو خلفاے راشدین کا اسی مسندِ رسولؐ پر یکے بعد دیگرے فائز ہونا بتا رہا ہے کہ اسلامی نظام کا قیام، اس کا چلانا حتیٰ کہ خلیفۃ المسلمین اور صدرِ مملکت ہونا بھی اتنا ہی اہم ہے جتنی دوسری عبادتیں بلکہ ذمہ داریوں کی گرانباری سے ممکن ہے یہ منصب دیگر نوافل کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی ثواب کا باعث ہو اس لیے کہ حکومت کی باگ ڈور لے کر تقویٰ کی راہ پر چلنا انتہائی دشوار تر معاملہ ہے۔ آج کے صاحبان تقویٰ کو سوچنا چاہیے کہ کیا ان کا تصورِ تقویٰ خدانخواستہ خلفاے راشدین اور حضورؐ سے بھی بڑھا ہوا ہے کہ انہیں اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد میں شمولیت سے اس کے خراب ہو جانے کا اندیشہ لاحق ہے یا پھر وہ اپنی بے ہمتی اور عافیت پسندانہ فطرت کی خاطر کشمکشِ حق و باطل سے فرار کی راہ تلاش کرنے کا جواز ڈھونڈھ رہے ہیں اس لیے دنیا کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ نظام باطل کے خلاف

جدوجہد کرنے والے اور اسلامی تحریک اور اقامتِ دین کے علمبردار اقتدار کے بھوکے ہیں، ان کے اندر نہ للہیت ہے اور نہ اخلاص اس لیے ان سے تعاون کرنے کے بجائے گریز ہی موزوں و مناسب ہے۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ ان کا یہ کہنا خود انہیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ اگر آپ کو کسی کے اندر اخلاص نظر نہیں آتا تو آپ ہی آگے بڑھیے اور قیادت کے فرائض انجام دیجیے مگر یہ کیا، کہ اندیشہ ہائے گوناگوں کو بنیاد بنا کر نہ خود چلیں اور نہ دوسروں کو چلنے دیں اور تبلیغ و جہاد فی سبیل اللہ کے مصائب کے تصور سے خوف کھا کر فرض منصبی سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔

ایک بزرگ نے انبیاءؑ کے اسوہ اور مزاج نبوت کا یہ خاصہ بالکل صحیح بتایا ہے کہ وہ شرک سے شدید نفرت کرتا ہے اور اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں "معبودانِ باطل" کو ناقابلِ برداشت سمجھتا ہے لیکن اس حقیقت سے صرفِ نظر کیسے کر لیا جاتا ہے کہ اس سائنسی دور میں مٹی کے بتوں کی پوجا ختم ہوتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ نئے نئے فکری بت تراشے جا رہے ہیں جن کو صفاتِ خداوندی کے مقابل لا کھڑا کیا گیا ہے۔ کیا ان بتانِ عصرِ حاضر کو پاش پاش کرنا ویسا ہی ضروری نہیں جیسا مٹی کے بتوں کو توڑنا ہے۔ آخر دونوں میں نفسِ روح کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ موجودہ دَور میں مملکت کی ہمہ گیری اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ہر فرد سے یہی چاہتی ہے کہ حکومت کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے وہی حق ہے جسے ایوان حکومت حق کہے۔ اس کا جینا اور مرنا اسی کی خاطر ہو۔ وہ چاہتی ہے کہ فرد اس کی خاطر اپنے آپ کو بالکل مٹا ڈالے اور اپنی تمام خواہشوں اور جذبات کو اس کی مشیّت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے۔ یعنی آج وہ فرد سے مکمّل وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے اور وہی مرتبہ حاصل کرنا چاہتی ہے جو دین میں خدا کو حاصل ہے

اور اس طرح وہ عصرِ جدید کا سب سے بڑا بت بن جاتی ہے۔ کیا اس بت کو توڑنا علمبرداران توحید کے لیے فرض نہیں ہے؟ کیا ان حکومتوں کی پوزیشن ٹھیک ٹھیک ویسی ہی نہیں ہے جیسی فرعون کی حکومت کی ہمہ گیری کی تھی جس نے اس سے انا ربکم الاعلیٰ کہلوایا تھا اور جس کی سرکشی کو توڑنے کے لیے موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔ پھر آج اس ذمہ داری سے مسلمان کس طرح خود کو بری الذمہ قرار دے سکتے ہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ فریبِ علم کے ساتھ فریبِ نفس بھی ہوگا اور جذبۂ توحید کے منافی بھی ہوگا۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے مسلمانوں کی اسی غلط فہمی کو اس طرح دور کیا تھا۔

"قریش مکہ نے اپنے بڑوں کی مورتیں بنا رکھی تھیں۔ تم نے دنیوی تاج و تخت اور حکام و امراء کو ان کی جگہ دیدی ہے۔ تم ان سے اس طرح ڈرتے اور ان کے نام سے کانپتے ہو جو صرف خدا ہی کے ساتھ سزاوار تھا۔ تم ان کا ذکر اس احترام و عظمت سے کرتے ہو جو صرف خدا ہی کا حق خالص تھا۔ تم ان کے آگے اس عاجزی و ذلت سے جھکتے ہو جو صرف خدا ہی کے سامنے زیب دیتی تھی تم ان کے احکام جائرہ اور اوامر مستبدہ کی اس طرح بلا چون و چرا تعمیل کرتے ہو جس کا حق خدا کے سوا کسی ہستی کو نہ تھا۔ تم خدا کے گھر کے اندر ان کا ذکر کرتے اور ان کی تعریف و تہنیت میں گیت گاتے ہو اور ان کے حکموں اور فرمانوں کا منبروں پر چڑھ چڑھ کر اعلان کرتے ہو پھر اگر یہ شرک فی الصفات نہیں ہے تو کیا ہے؟ کیا شرک و بت پرستی بغیر پتھر کی مورت اور بغیر قربانی کے بچھڑے کے ممکن نہیں؟ کیا شرک و بت پرستی کا گھر دل اور ارادہ نہیں بلکہ مندر کا کلس اور پوجا کا چبوترہ ہے۔"

(مقالات الہلال صفحہ ۳۸)

یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ خود مٹی کے بت توڑنے کے لیے بھی اسلامی ریاست اور حکومتِ الٰہیہ کا وجود ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مکی دور میں ہمیں کسی ایک واقعہ کی نشاندہی نہیں ملتی جب مٹی کے بتوں کو ہاتھ لگایا گیا ہو لیکن اسلامی ریاست اور اقتدار حکومت کے بعد جب فتح مکہ ہوا تب ان اصنامِ خاکی کو توڑا گیا اور خانۂ خدا کو ان کے وجود سے پاک کیا گیا جو خود اس بات کا ثبوت ہے کہ مٹی کے بتوں کا توڑنا بھی اسلامی حکومت کے قیام پر منحصر ہے۔ یہ بات بھی نگاہ سے اوجھل نہ رہنی چاہیے کہ اسلامی حکومت کا قیام صرف مٹی کے بتوں کے توڑنے ہی کے لیے نہیں ہے بلکہ خود توحید کا وسیع مفہوم اُسی وقت آشکارا ہوتا ہے جب زندگی کے ہر شعبے 'عبادات سے لے کر سیاست تک' میں ایک خدا کی اطاعت شروع ہو جاتی ہے اور ایک خدا، ایک انسان اور ایک نظام کا فلسفہ عملاً دنیا کے سامنے ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ عام لوگوں کی نگاہوں سے یہ نکتہ اوجھل رہا ہو لیکن اقبال کی بصیرت سے مستور نہ رہ سکا چنانچہ "اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید" میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اسلام بحیثیت ایک نظامِ سیاست کے اصولِ توحید کو انسانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریقہ ہے۔ اس کا مطالبہ وفاداری خدا کے لیے ہے نہ کہ تخت و تاج کے لیے اور چونکہ ذاتِ باری تمام زندگی کی روحانی اساس ہے اس لیے اس کی اطاعت کیشی کا درحقیقت یہ مطلب ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت (اعلیٰ صفات) کی اطاعت کیشی اختیار کرتا ہے[1]

---

[1] اصل انگریزی عبارت اس طرح ہے۔

Islam as a POLITY is only a practical means of making this principle (Tauhid)

(باقی صفحہ آئندہ پر)

مختصر یہ کہ اقبال عبادات معروف سے لے کر معاشیات، اقتصادیات، معاشرت، سیاست اور تمدّن وغیرہ کو ایک ہی فکر "فکرِ توحید" کے تحت دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک "لیظھرہ علی الدین کلہ" کا مژدہ جانفزا اسی وقت مادی تعبیر بنتا ہے اور مرئی شکل اختیار کرتا ہے جب حکومت کا نظام اور اقتدار بھی علمبرداران توحید کے ہاتھوں میں ہو اور خدائے واحد کے احکامات و اوامر سے تمام شعبہائے حیات کی صورت گری کی جا رہی ہو اور باطل قوتیں اس خدائی خلافت و نیابت کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو ان کا مقام یاد دلایا اور

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ

(سورۂ نور) کے وعدۂ ربانی کی حقیقت اس طرح پیش کی

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

جہاں تمام ہے میراث مردِ مومن کی — مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

اسلام چونکہ ایک حقیقت ہے اس لیے تا قیامت اس کو فنا نہیں اس کی

---

a living factor in the intellectual and emotional life of mankind. It demands loyalty to God, not to thrones. And since God is the ultimate spiritual basis of all life, loyalty to God virtually amounts to man's loyalty his own ideal nature. (The Reconstruction of Religion Thought in Islam, P-140).

مثال سدا بہار بیج کی طرح ہے جس کو جب بھی زمین میں ڈالا جائے گا اور مناسب گرمی، ہوا اور پانی بہم پہنچایا جائے گا وہ برگ و بار لا کر ہی رہے گا۔ چنانچہ اقبال کے نزدیک یہ تو ممکن ہے کہ جب امت مسلمۂ اسلام، کے اصولوں سے غفلت برتے تو اُسے منصبِ خلافت اور دنیا کی امامت سے ہٹا دیا جائے لیکن جب کبھی بھی وہ "اسلام" ہی کے لیے اٹھ کھڑی ہوگی تو پھر وہی سب کچھ ظہور میں آئے گا جس کا مشاہدہ دنیا خلفائے راشدین کے دَور میں کر چکی ہے۔ دورِ حاضر میں جس طرح سرمایہ دارانہ جمہوریت، ملحدانہ اشتراکیت، سوشلزم اور فاشزم نے انسانوں کے امن و امان کو غارت کیا ہے، اُن روحانی قدروں کو فنا کے گھاٹ اتارا ہے جنہیں انسان اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے، خود غرضی اور ہوس پرستی نے جس طرح انسانوں کو جنگلی درندوں سے بھی بدتر بنا دیا ہے اور انسانیت انکی درندگی سے کراہ رہی ہے اور جس طرح ظلم و تشدد کا دَور دورہ ہے اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ بے چین انسانیت جلد یا دیر اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر کے رہے گی اور پھر اسی درماں کو تلاش کرے گی جس سے اس کے تمام زخم مندمل ہو سکیں اور یہ "درماں" ہمیشہ کی طرح اسلام ہی ہوگا۔ اقبال کو اس کا صرف شدید احساس ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ دورِ سکون، آ کر رہے گا اسی لیے وہ نہ صرف آبِ رواں کبیر کے کنارے کسی اور زمانے کا خواب دیکھتا ہے بلکہ صاف صاف کہتا ہے

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے — یہ فضا معمور ہوگی نغمۂ توحید سے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا — لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

لیکن اس کے لیے جس ایمانی سوز و گداز، عملی پاکیزگی اور علمی برتری کی ضرورت ہے اقبال کو ان کا دور دور تک کہیں نشان نظر نہیں آتا تھا۔ مدرسہ و خانقاہ اپنی جدت طرازیوں، موشگافیوں اور زندگی کی کشمکش سے عملاً کنارہ کشی سے بے معنی

ہو کر رہ گئے تھے۔ ہر طرف ان کا کام ملّتِ اسلامیہ میں خانہ ساز کلامی بحثوں کے ذریعہ افتراق ونفرت کے شعلے بھڑکانے رہ گئے تھے فساد فی سبیل اللہ اُن کا وطیرہ بن چکا تھا، اخلاق وکردار کی وہ بلندی جو ایک مومن کا طرّہ امتیاز ہے اس سے ان کی زندگیاں خالی ہو چکی تھیں، ہوس پرستی اور مصلحت پسندی نے اُن کو ہر در کا غلام بنا دیا تھا، غلامانہ ذہن نے اسلام کا سیلِ رواں بن کر طوفانِ باطل کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کے بجائے انہیں تخت وتاج کے لیے دستِ دعا اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ مختصر یہ کہ حرم خود پیرانِ حرم کی کم نگاہی سے رسوا ہو رہا تھا اس لیے اُن سے کسی بڑے کام کی توقع نہ تھی یہی احساس واضطراب تھا اور یہی دل کی خلش تھی جس نے بوقتِ مرگ اقبال سے کہلوایا۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

اقبال قرآن میں غوطہ زن ہو کر اور پیغمبر برحق نبی کریمؐ کے عشق میں سرشار ہو کر اسلام کے جس رازدار و(۱) کو پا چکا تھا اس کو عام کرنے اور مردہ دلوں میں روحِ حیات پھونکنے کے لیے اس نے شاعری کو اختیار کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں

---

(۱) اقبال کی اسلامی بصیرت اور علمی گہرائی کے بارے میں میرے بزرگ مولانا علی میاں نے ایک بار فرمایا "میں نے بہت سے لوگوں کو سنا ہے اور پڑھا ہے لیکن اپنی علمی کم مائیگی کے باوجود یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کون کہاں سے بول رہا ہے مگر جب اقبال کو پڑھتا ہوں تو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کہاں سے بول رہا ہے"۔ میرے خیال میں مولانا علی میاں جیسے رمز شناسِ اسلام کے یہ تاثرات "سندِ آخر" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس سے بہتر تعریف اقبال کے قرآنی علم وآگہی اور اسلامی بصیرت کی نہیں کی جا سکتی۔ اسی سے اس راز کی بھی عقدہ کشائی ہو جاتی ہے کہ مولانا مودودی نے سوٹ بوٹ میں ملبوس ایک بارایٹ لا کو کیوں اپنا روحانی سہارا کہا تھا۔

کردہ اپنی الہامی شاعری کے ذریعہ ہزاروں لاکھوں افراد کے ذہنوں پر صاعقہ بن کر کڑکا، اُس نے اُن کے دلوں کے بند دروازوں پر دستک دی، ان کے ضمیر کو رازِ کائنات سے آشنا کیا، ان کی نگاہوں کو بصیرت عطا کی، ان کو بتایا کہ تم کیا تھے اور کیا ہو گئے اور کیا ہونا چاہیے؟ تمہاری زندگی کا اعلیٰ ترین مشن کیا ہے اور دورِ حاضر کی تاریخ کشمکش میں کیا رول ادا کرنا ہے؟ مگر شاعری روح تخیل کو پیش کر سکتی ہے۔ اس کی تفصیلات و جزئیات کو منطقی طور پر بیان کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال نے اسلام کے اساسی اصولوں کو شعر کا قالب پہنا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر شعر قلبِ سلیم کے لیے شمشیر بُراں کی سی تیزی رکھتا ہے اور اس کا شعلہ نوائی مثلِ قندیل رہبانی ہے جس نے کتنے ہی مائل بہ الحاد ذہنوں کی تقدیر بدل کر رکھ دی لیکن اسلامی نظام کے تمام خدوخال اس کی جزئیات کے ساتھ اجاگر کرنا، ایک ایک شعبۂ زندگی کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم کرنا، عصرِ حاضر کے پیدا کردہ سوالات کا مفصل جواب دینا، اجتماعی زندگی کا مکمل خاکہ تیار کرنا اور اس کے لیے ایک تنظیم برپا کرنا جو عملاً انہیں اصولوں کو لے کر میدانِ حیات میں اترے، ہر باطل قوت سے صف آرا ہو، شکست و فتح کے معرکوں سے گزرے، بدر و حنین کی تاریخیں دہرائی جائیں اور فتحِ مکہ کا دورِ کامیاب اس مسلسل جد و جہد کے نتیجہ میں پھر حاصل ہو، اس کے لیے صرف شاعری کافی نہیں ہے۔ خود اقبال بھی اس راز سے واقف تھے اور خود اپنی ذات کو اس کام کے لیے موزوں و مناسب نہ سمجھتے تھے چنانچہ ایک ایسے امام برحق کی ضرورت محسوس کرتے تھے جس کی نگاہ زلزلۂ عالمِ افکار ہو اور جس کی صفات کی نشاندہی ان الفاظ میں کی ہے

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

اقبال اپنے سینہ میں اضطراب پیہم اور سوزِ دروں کے ساتھ اس شخصیت کے لیے مصروف جستجو اور آرزو مند تھے جو متذکرہ بالا اوصاف کا حامل ہو اور جس کے ہاتھوں اُس کے خواب کی عملی تعبیر میسر آسکے۔ اگرچہ اس وسیع و عریض سرزمین میں چاروں طرف علمائے دین کی کمی نہ تھی، درس و تدریس کا نظام بھی خوب چل رہا تھا، سیکڑوں ہزاروں سند یافتہ علماء بھی موجود تھے لیکن جس جوہر خالص کی ضرورت تھی، جس روحِ ناصبور کی تلاش تھی، جس یقین کے پتلے کی جستجو تھی، جو ایمان و اصول کے معاملہ میں قرآن اور عمل کے معاملہ میں اسوۂ رسول کا نشان ہو وہ شخصیت ناپید تھی۔ اقبال کی آرزوئے خالص نے بالآخر برسوں کی جستجو کے بعد ابوالاعلیٰ کی شکل میں اس شخصیت کو پا لیا جس کا انہیں شدت سے انتظار تھا یہ تیس پینتیس سال کا نوجوان تھا مگر اقبال کی نگاہ اس پر جمی۔ اس کے قلب کی یکسوئی، ذہن کی رسائی، علمی برتری، اسلام کے سلسلہ میں غیر متزلزل یقین، خدا اور رسول کے معاملہ میں ہر لومتہ لائم سے بے پروائی، راہِ حق پر استقامت اور آزمائش و مصائب میں صبر و رضا کی صفت نے اقبال کو مطمئن کر دیا تھا کہ اسلام کو جس طرز کے رہنما کی اس وقت ضرورت ہے ابوالاعلیٰ اس کے مطابق ہیں اور مستقبل کی امیدیں اُن سے وابستہ کی جاتی ہیں چنانچہ ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال نے انہیں پٹھان کوٹ آنے کی دعوت دی تا کہ

ایک منظم خاکے کے مطابق باہمی مشوروں کے ذریعہ کام کیا جاسکے مگر خدا کی مرضی کے سامنے کس کی چلی ہے اقبال اپنا کام پورا کر چکے تھے اس لیے خدا کی بارگاہ میں بلا لیے گئے اور ایک عظیم کام کی ساری ذمہ داری تنہا ابوالاعلیٰ کے سر آپڑی۔

جس طرح علامہ اقبال مغربی علوم کے بادہ رنگیں کو پی کر اسلام کے شیدائی بنے تھے اور قرآن کو تمام مسائل حیات کا حل سمجھتے تھے ٹھیک یہی صورت مولانا ابوالاعلیٰ کے ساتھ تھی۔ وہ اپنی سرگزشت خود ہی بیان کرتے ہیں۔

"جاہلیت کے زمانہ میں میں نے بہت کچھ پڑھا ہے۔ قدیم و جدید فلسفہ، سائنس، معاشیات و سیاسیات وغیرہ پر اچھی خاصی ایک لائبریری دماغ میں اتار چکا ہوں۔ مگر جب آنکھ کھول کر قرآن کو پڑھا تو بخدا یوں محسوس ہوا کہ جو کچھ پڑھا تھا سب ہیچ ہے۔ علم کی جڑ اب ہاتھ آئی۔ کانٹ، ہیگل، نیٹشے، مارکس اور دنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین اب مجھے بچے نظر آتے ہیں۔ بے چاروں پر ترس آتا ہے کہ ساری عمر جن گتھیوں کے سلجھانے میں الجھتے رہے اور جن مسائل پر بڑی بڑی کتابیں تصنیف کر ڈالیں پھر بھی حل نہ کر سکے اُن کو اس کتاب نے ایک ایک دو دو فقروں میں حل کر کے رکھ دیا۔ میری اصلی محسن بس یہی کتاب ہے۔ اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے، حیوان سے انسان بنا دیا، تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئی، ایسا چراغ میرے ہاتھ میں دے دیا کہ زندگی کے جس معاملے کی طرف نظر ڈالتا ہوں حقیقت اس طرح برملا دکھائی دیتی ہے کہ گویا اس پر پردہ نہیں ہے۔"

قرآن کے اسرار و معارف کی اس آگاہی نے مولانا مودودی کو ماہیٔ بے آب بنا دیا، جس خدا کو عقل و خرد کی کسوٹی پر پرکھ کر قبول کیا تھا اس کے

احکام کے سامنے گردن ڈال دی۔ توحید کے جو معنی قرآن نے بتائے اسی کو دل کی گہرائیوں میں اتار لیا اور نبوت کے جس مشن کی اس نے نشاندہی کی اس کو حرزِ جاں بنا لیا۔ اب تفریق دین و دنیا کا تصوّر باطل ٹھہرا، ایک خدا، ایک انسان، ایک نظام کا فلسفہ مقصدِ حیات بنا۔ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جسم و جان کا سودا بھی ارزاں معلوم ہوا، باطل قوتوں کے مقابلہ میں دعوتِ حق دینا شیوہ بنا، دنیاوی اقتدار و قوت کے خوف سے دل پاک ہوا اور خدائے واحد میں وہ سب کچھ مرکوز پایا جسے دنیا والوں نے مختلف ہستیوں کے اندر تقسیم کر رکھا تھا۔ توحید کے جس وسیع تصور کے علامہ اقبال نقیب تھے مولانا مودودی بھی اسی کے علمبردار تھے۔ درجِ ذیل اقتباس اس کی واضح مثال ہے

"توحید کا یہ تصور محض ایک مذہبی عقیدہ نہیں ہے جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں۔ اس سے اجتماعی زندگی کا وہ پورا نظام، جو انسان کی خود مختاری یا غیر اللہ کی حاکمیت و الوہیت کی بنیاد پر بنا ہو، جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے اور ایک دوسری اساس پر نئی عمارت تیار ہوتی ہے۔ آج دنیا آپ کے موذنوں کو اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لیے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں، نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور کوئی مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ —— میرا کوئی بادشاہ اور فرماں روا نہیں ہے، کوئی حکومت ہی تسلیم نہیں کرتا، کسی قانون ہی کو نہیں مانتا، کسی عدالت کے حدود اختیار مجھ تک نہیں پہنچتے، کسی کا حکم میرے لیے حکم نہیں ہے، کوئی رواج

اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں، کسی کے امتیاری حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا، ایک اللہ کے سوا میں سب سے باغی اور سب سے منحرف ہوں۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس "صدا" کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ آپ خواہ کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں دنیا خود بخود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکایک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہو گئے ہیں اور ہر طرف آپ کے لیے سانپ بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔ یہی صورت اس وقت پیش آئی جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آواز بلند کی۔ پکارنے والے نے جان کر پکارا تھا اور سننے والے سمجھتے تھے کہ کیا پکار رہا ہے اس لیے جس پر جس پہلو سے بھی اس پکار کی ضرب پڑتی تھی وہ اس کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ پجاریوں کو اپنی برہمنیت اور پاپائیت کا خطرہ اس میں نظر آیا، رئیسوں کو اپنی ریاست کا، ساہوکاروں کو اپنی ساہوکاری کا، نسل پرستوں کو اپنی نسلی تفوق (Racial Superiority) کا، قوم پرستوں کو اپنی قومیت کا، اجداد پرستوں کو اپنے باپ دادا کے موروثی طریقہ کا، غرض ہر بت کے پرستار کو اپنے بت کے ٹوٹنے کا خطرہ اس ایک آواز میں محسوس ہوا اس لیے الکفر ملۃ واحدہ، وہ سب جو آپس میں لڑا کرتے تھے، اس نئی تحریک سے لڑنے کے لیے ایک ہو گئے۔"

(اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے)

ایک عام سیاسی حکومت جو ملکی نظم و نسق چلانے کے لیے قائم ہوتی ہے اور

خلافت علی منہاج النبوۃ (اسلامی حکومت) کے فرق کو واضح کرتے ہوئے مولانا مودودی نے بتایا :-

"خلافت راشدہ، جس کے امتیازی خصائص اور بنیادی اصول گذشتہ صفحات میں بیان کیے گئے ہیں حقیقت میں محض ایک سیاسی حکومت نہ تھی، بلکہ نبوت کی مکمل نیابت تھی یعنی اس کا کام صرف اتنا نہ تھا کہ ملک کا نظم ونسق چلائے، امن قائم کرے اور سرحدوں کی حفاظت کرتی رہے بلکہ وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں معلم، مربی اور مرشد کے وہ تمام فرائض انجام دیتی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں انجام دیا کرتے تھے اور اس کی یہ ذمہ داری تھی کہ دار الاسلام میں دین حق کے پورے نظام کو اس کی اصل شکل و روح کے ساتھ چلائے اور دنیا میں مسلمانوں کی پوری اجتماعی طاقت اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی خدمت پر لگادے اس بناء پر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ صرف خلافتِ راشدہ ہی نہ تھی بلکہ خلافت مرشدہ بھی تھی۔ خلافت علی منہاج النبوۃ کے الفاظ اس کی انہیں دونوں خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں اور دین کی سمجھ رکھنے والا کوئی شخص بھی اس بات سے ناواقف نہیں ہوسکتا کہ اسلام میں اصل مطلوب اسی نوعیت کی ریاست ہے نہ کہ محض ایک سیاسی حکومت"[1]

(خلافت و ملوکیت صفحہ ۹۶)

---

[1] جو لوگ اپنے گروہی اور معاصرانہ تعصب وحسد کی بناء پر مولانا مودودی کی واضح تحریریں پڑھ کر بھی یہ الزام لگاتے ہیں کہ اُن کی فکر مغربی ذہن سے متاثر ہے اس لیے وہ حکومت کے قیام پر زور دیتے ہیں اُنہیں چاہیے کہ مولانا کے اس اقتباس کو بار بار پڑھیں

(باقی صفحہ آئندہ پر)

مولانا مودودی نے مسلمانوں کے اندر اخلاقی اور عملی وفکری خرابیوں کا ادراک کر کے پہلے اس کی کوشش کی کہ اسلام کو بے کم وکاست دو ٹوک لفظوں میں ان کے سامنے تفصیل سے رکھ دیا جائے، حضورؐ کے اسوہ حسنہ سے انکے دلوں میں راہِ اسلام پر چلنے کے لیے تڑپ پیدا کی جائے اور پھر جب مختلف طریقوں سے یہ کام معتد بہ حد تک ہو جائے تب اُن روحوں کو آواز دی جائے جو اسلام میں پورے کے پورے شعور کے ساتھ داخل ہونے کے لیے تیار ہوں۔ برسوں کی تحریری اور قلمی کاوشوں کے بعد جب انہیں محسوس ہو گیا کہ اب اجتماعی طور پر کام کی بنیاد ڈالی جا سکتی ہے تب "ترجمان القرآن" میں "دیوانوں کی ضرورت" کے عنوان سے موانع راہ اور مشکلاتِ دین کو اجاگر کرتے ہوئے اس طرح آواز دی:

> "اب وقت آگیا ہے کہ ہم کو مسلمان رہنے یا نہ رہنے کا آخری فیصلہ کرنا ہے۔ اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ماحول کو اور پھر تمام دنیا کو دارالاسلام بنانے کا عزم لے کر اٹھنا چاہیے اور اس کے لیے

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اور دیکھیں کہ انہیں کس طرح کی ریاست یا حکومت درکار ہے۔ اسی طرح ایک گروہ مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کو قرآن کی سیاسی تفسیر کہتا ہے حالانکہ حقیقت صرف اتنی ہے کہ اسلامی زندگی کے جس مسئلہ کو برسوں سے نظر انداز کیا گیا تھا مولانا نے اُسے بے کم و کاست پیش کیا ہے تاکہ سیاسی رخ بھی مسلمانوں کے سامنے کھل کر آجائے اور قرآن کی تعلیم کے صحیح و ہمہ گیر مفہوم کا اندازہ ہو سکے تاکہ امامت صالحہ کی تیاری کا جذبہ اُن کے اندر ابھرے جس کے بغیر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔

جان و تن کی بازی لگا دینی چاہیے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تسلیم کر لیجیے کہ اس وقت کفر کی طاقتوں کے قاہرانہ اور ہمہ گیر تسلط کو دیکھتے ہوئے جو شخص دارالاسلام کا نصب العین لے کر اٹھتا ہے وہ قطعی دیوانہ ہے اور آگ سے کھیلنا چاہتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس حالت میں مقابلے کے لیے اٹھنا فی الواقع دیوانوں ہی کا کام ہے ایسے دیوانوں کا جو جان بوجھ کر آگ میں کودنے کے لیے تیار ہوں۔ ۔ ۔ ۔ مسلمان متحد ہو کر آپ کے لیے نہیں اٹھیں گے بلکہ بہت سے مدعیانِ علم و تقویٰ تو آپ پر الٹے دل شکن آوازیں کسیں گے اور آپ کی دیوانگی کا مذاق اڑائیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سب باتوں کو خوب جان کر اور سمجھ کر اپنے قلب کا جائزہ لیجیے کہ اس میں مسلمان رہنے کا جذبہ اس دیوانگی کی حد تک پہنچا ہوا ہے یا نہیں کہ جو چیز بظاہر بالکل ناممکن الحصول نظر آتی ہے اور جس کے حصول کی کوشش میں جان و مال کا کھلا ہوا زیاں ہے اس کی خاطر سر اور دھڑ کی بازی لگا دینے کے لیے تیار ہو جائے۔"

"جن لوگوں میں یہ دیوانگی موجود ہے اور جو اپنے مقصد کی راہ میں لڑتے ہوئے ناکام مر جانے کو دنیا کی ساری کامرانیوں پر ترجیح دینے کے لیے تیار رہیں صرف انہیں کی ہم کو ضرورت ہے اور وہی دارالاسلام کی تحریک بھی چلا سکتے ہیں۔"

پھر خدا کی شریعت کے بارے میں یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ:۔

"یہ شریعت بزدلوں اور نامردوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ نفس کے بندوں اور دنیا کے غلاموں کے لیے نہیں اتری ہے۔ ہوا کے رُخ پر اڑنے والوں، خس و خاشاک اور پانی کے بہاؤ پر بہنے والے حشرات الارض

اور ہر رنگ میں رنگ جانے والے بے رنگوں کے لیے نہیں اتری ہے۔ یہ ان بہادر شیروں کے لیے اتری ہے جو ہوا کا رخ بدل دینے کا عزم رکھتے ہوں، جو دریا کی روانی سے لڑنے اور اس کے بہاؤ کو پھیر دینے کی ہمت رکھتے ہوں، جو صبغۃ اللہ کو دنیا کے ہر رنگ سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں اور اسی رنگ میں تمام دنیا کو رنگ دینے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ مسلمان جس کا نام ہے وہ دریا کے بہاؤ پر بہنے کے لیے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی آفرینش کا تو مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کے دریا کو اس راستہ پر رواں کر دے جو اس کے ایمان و اعتقاد میں راہِ راست ہے، صراط مستقیم ہے۔ اگر دریا نے رخ اس راستہ سے پھیر دیا ہے تو اسلام کے دعویٰ میں وہ شخص جھوٹا ہے جو اس بدلے ہوئے رُخ پر بہنے کے لیے راضی ہو جائے۔ حقیقت میں جو سچا مسلمان ہے وہ اس غلط رو دریا کی رفتار سے لڑے گا۔ اس کا رُخ پھیرنے کی کوشش میں اپنی پوری قوت صرف کر دے گا۔ کامیابی و ناکامی کی اس کو قطعًا پروا نہ ہوگی۔ وہ ہر اُس نقصان کو گوارہ کرے گا جو اس لڑائی میں پہنچے یا پہنچ سکتا ہو حتیٰ کہ اگر دریا کی روانی سے لڑتے لڑتے اس کے بازو ٹوٹ جائیں، اس کے جوڑ بند ڈھیلے ہو جائیں اور پانی کی موجیں اُسے نیم جاں کر کے کسی کنارے پر پھینک دیں تب بھی اس کی روح ہرگز شکست نہ کھائے گی۔ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں اپنی اس ظاہری نامرادی پر افسوس یا دریا کی رَو پر بہنے والے کافروں یا منافقوں کی کامرانیوں پر رشک کا جذبہ راہ نہ پائے گا۔“ (تنقیحات)

مولانا مودودی نے مسلمانوں کو ان کا منصب اور مقام یاد دلانے کے بعد

ایک صالح اجتماعی تنظیم کی اہمیت پر زور دیا اور ان کے دلوں میں یہ بات اتارنے کی کوشش کی کہ محض کسی عقیدہ یا نظریہ حیات کے صحیح ہونے سے کوئی انقلاب برپا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے صرف ایسے افراد کا پایا جانا بھی کافی نہیں ہے جو اس نظریۂ زندگی پر پورا یقین رکھتے ہوں اور اس کے لیے ہر قربانی و ایثار کے لیے تیار رہیں بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ایسے مردانِ کار کی ایک مضبوط اور مربوط تنظیم ہو تاکہ وہ اجتماعی طور پر اور منظم طریقے سے اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کا استعمال کر سکیں اور ایک طاقتور گروہ بن کر باطل طاقتوں کے ظلم و جبر سے انسانوں کو بچا سکیں۔

"پس دنیا کو آئندہ دورِ ظلمت کے خطرہ سے بچانے اور اسلام کی نعمت سے بہرہ ور کرنے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ یہاں صحیح نظریہ موجود رہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے اس کے لیے ایسے لوگ درکار ہیں جو اس نظریہ پر سچا ایمان رکھتے ہوں۔ ان کو سب سے پہلے اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہوگا اور وہ صرف اسی صورت سے دیا جا سکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں اس کے خود مطیع بنیں، جس ضابطے پر ایمان لاتے ہیں اس کے خود پابند ہوں، جس اخلاق کو صحیح کہتے ہیں اس کا خود نمونہ بنیں، جس چیز کو فرض کہتے ہیں اس کا خود التزام کریں اور جس چیز کو حرام کہتے ہیں اُسے خود چھوڑ دیں۔ اس کے بغیر تو ان کی صداقت آپ ہی مشتبہ ہوگی کجا کہ کوئی ان کے آگے سرِ تسلیم خم کرے۔ پھر ان کو اس فاسد نظامِ تہذیب و تمدن و سیاست کے خلاف عملاً بغاوت کرنی ہوگی، اس سے اور اس کے پیرووں سے تعلق توڑنا ہوگا، ان تمام فائدوں، لذتوں،

آسائشوں اور امیدوں کو چھوڑنا ہوگا جو اس نظام سے وابستہ ہوں، اور رفتہ رفتہ ان تمام نقصانات، تکلیفوں اور مصیبتوں کو برداشت کرنا ہوگا جو نظام غالب کے خلاف بغاوت کرنے کا لازمی نتیجہ ہیں۔ پھر انہیں وہ سب کچھ کرنا ہوگا جو ایک فاسد نظام کے تسلط کو مٹانے اور ایک صحیح نظام قائم کرنے کے لیے ضروری ہے[1] اس انقلاب کی جدوجہد میں اپنا مال بھی قربان کرنا ہوگا، اپنے اوقات عزیز بھی قربان کرنے پڑیں گے، اپنے دل ودماغ اور جسم کی ساری قوتوں سے بھی کام لینا پڑے گا اور قید اور جلاوطنی اور ضبط اموال اور تباہی اہل وعیال کے خطرات بھی سہنے ہوں گے، اور وقت پڑے تو جانیں بھی دینی ہوں گی۔ ان راہوں سے گذرے بغیر دنیا میں نہ کبھی کوئی انقلاب ہوا ہے نہ اب ہوسکتا ہے۔ ایک صحیح نظریہ کی پشت پر ایسے صادق الایمان لوگوں کی جماعت جب تک نہ ہو محض نظریہ، خواہ کتنا ہی بلند پایہ ہو، کتابوں کے صفحات سے منتقل ہوکر ٹھوس زمین میں کبھی جڑ نہیں پھیلا سکتا۔ نظریہ کی کامیابی کے لیے خود اس کے اصولوں کی طاقت جس قدر ضروری ہے اسی قدر انسانوں کی سیرت، ان کے عمل اور ان کی قربانی و سرفروشی کی طاقت بھی ضروری ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہوں۔"

---

[1] اس سلسلہ میں مولانا مودودی کی مسجد دہلوی (مکہ معظمہ) والی تقریر بعنوان "احیائے اسلام کے لیے طریقہ کار" ملاحظہ فرمانا چاہیے جس میں جمہوری طریقہ سے انقلاب لانے کے طریقے پر زور دیا گیا ہے اور مسلح اور خفیہ تحریکوں سے اجتناب کا مشورہ دیا گیا ہے کیونکہ اس طرح سے لایا ہوا انقلاب دیرپا نہیں ہوتا۔

"اگرچہ خلوص ایمان اور قربانی و جانفشانی ہر دین کے لیے ناگزیر ہے، خواہ وہ دینِ حق ہو یا دینِ باطل، مگر دین حق اس سے بہت زیادہ اخلاص اور قربانی مانگتا ہے جو دین باطل کے قیام کے لیے درکار ہے۔۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ (آل عمران ۱۷۹)	اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ ایمان لانے والوں کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس پر تم لوگ اس وقت ہو (کہ مومن اور منافق سب خلط ملط ہیں) وہ نہ مانے گا جب تک کھوٹے کو کھرے سے الگ نہ کر دے۔

"۔۔۔۔۔۔ یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اللہ اپنے باغیوں کی سرکوبی نہیں کر سکتا اس لیے تم سے مدد مانگتا ہے۔ نہیں، وہ اتنی زبردست طاقت رکھتا ہے کہ چاہے تو ایک اشارے میں ان کو تباہ کر کے رکھ دے اور اپنے دین کو خود قائم کر کے رکھ دے۔ مگر اس نے یہ جہاد اور محنت و قربانی کا بار تم پر اس لیے ڈالا ہے کہ وہ تم انسانوں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں آزمانا چاہتا ہے۔ جب تک باطل پرستوں سے تمہارا تصادم نہ ہو اور اس تصادم میں مصائب و شدائد اور خطرات و مہالک پیش نہ آئیں، سچے اہل ایمان جھوٹے مدعیوں سے میز نہیں ہو سکتے اور جب تک ناکارہ لوگوں سے کار آمد آدمی چھٹ کر الگ نہ ہو جائیں وہ جتھا نہیں بن سکتا جو خلافت الٰہیہ کی ذمہ داری سنبھالنے کا اہل ہو۔ لہٰذا آج دنیا کا مستقبل درحقیقت اس امر پر منحصر نہیں

ہے کہ کوئی نظریہ حق انسان کو ملتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ نظریہ حق تو موجود ہے۔ البتہ وہ اگر منحصر ہے تو اس امر پر ہے کہ انسانوں میں سے کوئی ایسا گروہ اٹھتا ہے یا نہیں جو سچے ایمان اور دھن کے پکے اور اپنی ہر عزیز و محبوب چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔"

(مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ سوم)

اور تنظیم کے قیام کے بعد اپنی جد و جہد کا نصب العین صاف صاف یہ بیان کیا:

"ہماری جد و جہد کا آخری مقصود انقلاب امامت ہے یعنی دنیا میں فساق و فجار کی امامت ختم ہو کر امامت صالحہ کا نظام قائم ہو .... جماعت اسلامی کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود عملاً اقامتِ دین یعنی حکومت الٰہیہ، اسلامی نظام زندگی کا قیام اور حقیقتاً رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی کا حصول ہے۔"

ان اقتباسات کے پیش کرنے سے مقصود یہ تھا کہ قاری کو وہ نقطۂ نگاہ مل جائے جس سے وہ اقبال کی دعوت اور مولانا مودودی کے[1] مشن کو آسانی سے سمجھ سکے اور اس پر یہ راز بھی منکشف ہو جائے کہ یہی وہ انقلابی نظریہ تھا

---

[1] مولانا مودودی کے مشن کے متعلق شام کے ڈاکٹر طٰہٰ جابر کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

"مولانا مودودی مزاج شناسِ رسول تھے۔ انہوں نے دین کو اس شکل میں پیش کیا جس میں رسول اللہ نے پیش کیا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کلمہ اسلام کی سربلندی کے لیے صرف کی۔ جماعتِ اسلامی انہیں کے عظیم مقاصد کو آگے بڑھانے کا کام کر رہی ہے۔ اگر یہ جماعت مولانا کے کام کو آگے بڑھا سکی تو تمام اہل اسلام کے لیے خوشی کی بات ہو گی۔"

(مودودی نمبر الحسنات رام پور)

جسے قرآن نے پیش کیا، جسے خدا کے رسول ﷺ نے پیش کیا، جس پر چل کر صحابہ کرامؓ نے دنیا کو دکھا دیا کہ اس سے بہتر کوئی نظریہ زندگی اور ضابطہ حیات نہیں۔ یہی وہ انقلابی دعوت تھی جسے ابن تیمیہؒ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہؒ نے حالات کے علی الرغم پیش کیا اور یہی وہ فلسفۂ حیات تھا جس کے لیے علامہ اقبال سوز دروں سے مضطرب تھے اور جس کو لے کر مولانا مودودی نے عملاً تنظیم برپا کی اور اعلائے کلمۃ اللہ کا ایسا غلغلہ بلند کیا کہ کتنے ہی ممالک میں اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ تہذیب کے علمبردار آنکھیں چرانے لگے۔ ایران و پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام عمل میں آیا، افغانستان میں آنا چاہتا ہے اور جانے کتنی جگہیں ایسی ہیں جہاں اسلامی تحریک رفتہ رفتہ چھاتی چلی جا رہی ہے۔ لیکن اقبال و مودودی کے موضوع پر گفتگو اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک مغربی تہذیب کی بنیادیں، وطنیت بحیثیت سیاست، اسلامی قومیت تحریک آزادی نسواں، اشتراکیت و سرمایہ داری، ضبط ولادت، اسلامی اور مسلم حکومت کا فرق ظالم و مظلوم کے متعلق اسلامی نقطہ نظر، اسلامی اور عجمی تصوف میں فرق، قادیانیت اور اسلام سنت رسول کا منصب، اسلامی تہذیب کا مفہوم، مقام انسان و انسانیت، جہاد کی غایت اصلی، اسلامی فلسفہ تاریخ، لذت آہ سحرگاہی وغیرہ جیسے عنوانات پر اظہار خیال نہ کیا جائے لیکن میں نے ان عنوانات پر اظہار خیال سے قصداً احتراز کیا ہے۔ اوّل اس وجہ سے کہ "مقدمہ" کی تنگ دامانی اس کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لیے کہ ان میں سے ہر عنوان پر اقبال و مودودی نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ وہ خود ایک مقالہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے دوسرے زیر نظر کتاب میں پروفیسر عمر حیات صاحب غوری نے علامہ اقبال اور مولانا مودودی کی کتابوں کا تعارف کراتے ہوئے ان میں سے اکثر موضوعات پر اچھی خاصی روشنی ڈالی ہے۔

پروفیسر موصوف کی اس کتاب کے مطالعہ سے قارئین پر یہ حقیقت بھی اچھی طرح منکشف ہوجائے گی کہ جس وقت علمی دنیا میں مغربی نظام حیات اور اشتراکیت کا غلغلہ بلند تھا اس وقت مولانا مودودی نے کس طرح اسلام کو ایک عالمی نظام کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اسلام کے نظام عقاید و اخلاق، نظام معیشت و معاشرت، نظام تعلیم و تربیت، نظام معاشیات و تجارت، نظام سیاسیات اور انتظام مملکت، امور خارجہ اور نظام صلح و جنگ، اسلامی دستور اور نظام قانون اور بین الاقوامی تعلقات پر کتابیں لکھ کر کس طرح دنیا والوں سے انکا وجود تسلیم کرایا اور جدید مغربی نظام ہائے حیات سے موازنہ کرکے اسلامی نظام کی برتری ثابت کی اور ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو الحاد و اشتراکیت کی گود میں جانے سے بچا لیا اور انہیں الہٰی قانون کی خاطر مرنے اور جینے کا چلن دیا[۱] اس طرح یہ کتاب نئی نسل کے نوجوانوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ بن گئی ہے جس کے ذریعہ وہ علامہ اقبال اور مولانا مودودی کے نظریات

[۱] مولانا مودودی نے کس طرح نوجوان نسل کو متاثر کیا ہے اور ان کا علمی مقام کیا ہے اس کے لیے عالم اسلام کے دو مشہور علماء کے تاثرات ملاحظہ ہوں۔

مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی فرماتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ اس جدید تعلیم یافتہ نسل پر ذہنی و علمی طور پر مولانا مودودی نے گہرا اور نہایت وسیع اثر ڈالا ہے۔ انہوں نے اس نسل کی صدہا بے چین روحوں، ذہین اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے بلکہ اس کا گرویدہ بنانے اور اس کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ان کے علمی کام اور تحریکِ اسلامی کے متعلق بیش بہا معلومات حاصل کر سکے۔ ہیں۔ اُمید ہے یہ کتاب نئی نسل کو بہت سی کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گی۔

پروفیسر عمر حیات صاحب چونکہ کسی متعین مکتب فکر کے آدمی نہیں ہیں بلکہ خالص علمی ذوق کے آدمی ہیں اس لیے ان کی اس کاوشِ خاص سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

دل و دماغ میں اسلام کا اعتماد ، وقار بحال کرنے کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے ۔ جہاں تک اس تعلیم یافتہ اور ذہین (Intellectual) طبقہ کا تعلق ہے اس اثر انگیزی میں (اس ربع یا نصف صدی میں) مشکل سے کوئی مسلمان مصنف و مفکر ان کا مقابل و ہمسر ملے گا" (تعمیر حیات ، لکھنؤ)

جناب عبد الرشید ارشد صاحب علامہ طنطاوی کا تاثر اس طرح نقل کرتے ہیں :

" پاکستان کے ایک معمر اور نامور سیاست داں جناب مشتاق احمد گورمانی بیان فرماتے ہیں کہ حج کے موقع پر مجھے عالم اسلام کے جید مفسر قرآن "الجواہر" کے مصنف علامہ طنطاوی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو میں نے خواہش ظاہر کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو الجواہر کا اردو ترجمہ شائع کر دیا جائے ، تاکہ پاکستان کے مسلمان اس سے استفادہ کر سکیں تو علامہ طنطاوی انتہائی حیرت و تعجب سے فرمانے لگے کہ سید مودودی کی تفہیم کے بعد الجواہر کے ترجمے کی کیا ضرورت ہے ہم تو خود اس سے استفادہ کرتے ہیں ۔"

(مولانا مودودی نمبر جسارت کراچی)

اہلِ ذوق اور اہلِ علم بہت کچھ استفادہ کرتے ہیں۔ چونکہ وہ خود بھی اسلامی ذہن اور دل دردمند رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے اپنی اس تحریر کے ذریعہ کوشش کی ہے کہ نئی نسل جسے کثیر مطالعہ کی عادت نہیں ہے اس کتاب کے ذریعہ نہ صرف ان دو اکابر کی کاوشوں کو سمجھے بلکہ خود بھی اسلام کے علمبردار بن کر غارتگر ہر نقشِ باطل بن جائے اور امت وسط کے فریضے کو ادا کرے جس کے ادا نہ ہونے سے یہ دنیا ظلمتوں کے درمیان سرگرداں ہے اور حقیقی امن و سکون سے ناآشنا ہو کر رہ گئی ہے۔ خدائے عزیز و برتر سے دعا ہے کہ وہ مصنف کی توقعات کو پورا کرے اور نوجوانانِ اسلام کے دلوں میں انسانیت کے لیے وہ ولولہ، اضطراب اور تڑپ پیدا کر دے جو ایک قلب مومن کا خاصہ ہے۔

کچھ اور کتابیں

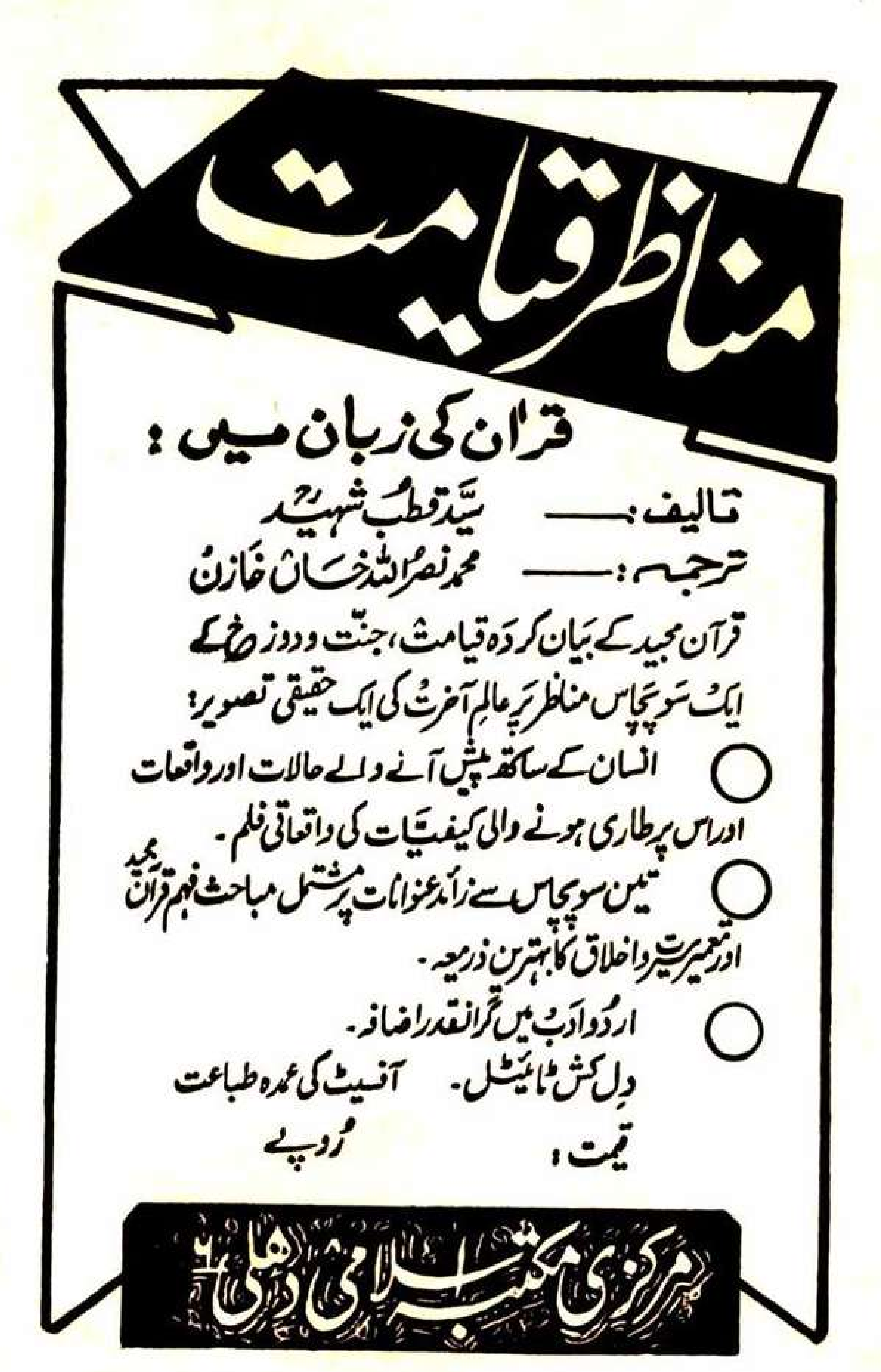
آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا	اخلاق حسین	۱۳/۰۰
اسلام اور جدید مادی افکار	محمد قطب	۲۵/۰۰
غلط فہمیاں	کیپٹن عبدالحفیظ	۱/۵۰
اسلامی انقلاب مخالف قوتیں اور مسلمان	سید علی	۲/۰۰
قومی یکجہتی اور اسلام	ڈاکٹر عبدالحق انصاری	۰/۷۵
امنِ عالم اور اسلام	سید قطب	۹/۵۰
دعوتِ اسلامی اور مسلمانوں کے فرائض	میاں طفیل محمد	۵/۰۰
انسان کا صحیح نصب العین	انعام الرحمٰن خاں	۱/۲۵
سیرت کا پیغام	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۱/۵۰
اسلام اور جدید مسائل	〃 〃	۱/۵۰
جادہ و منزل	سید قطب	۱۴/۰۰
ادبیاتِ مودودی	سید ابوالاعلیٰ مودودی	۲۰/۰۰
اسلامی تصوّف	مولانا سید احمد عروج قادری	۱۲/۰۰
ہندو دھرم۔ ایک مطالعہ	محمد فاروق خاں	زیر طبع
اسلام اور وحدتِ بنی آدم	سید جلال الدین	〃
وہ ایک لمحہ	انور بیدل	〃
نوائے زنداں	متین طارق	〃
مفکرِ اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی	چودھری عبدالرحمٰن	〃
علامہ اقبال اور مولانا مودودی	سید انور علی	〃
مولانا مودودی کے تعلیمی نظریات	محمد حسن ایم اے ایم ایڈ	〃
سفینۂ نجات	مولانا جلیل احسن	〃

۰/۵۰ THE QURAN & ITS WISDOM, by Hammudah Abdalati

۰/۵۰ ISLAMIC ECONOMIC SYSTEM - PRINCIPLES AND OBJECTIVES, by Syed Abul Ala Maududi

۰/۲۵ THE CONTRIBUTION OF THE MUSLIM MINORITY TO THE WELL-BEING AND PROGRESS, by Muhammad Yusuf

۰/۲۵ THE LAST PROPHET OF ISLAM, by Muhammad Yusuf



صرف ٹائیٹل دہلی آرٹ پریس دہلی میں چھپا